© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

عرب ممالک کی اسرائیل کے ہاتھوں شکست اور رسوائی کی جو تفصیلات ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن کے پسِ پردہ جھانکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے اُن میں سے کوئی بات بھی انہونی اور غیر متوقع نہ تھی۔ اس کے پیچھے وہ ساری تاریخی قوتیں کام کر رہی تھیں جو اس نوعیت کے حادثات کو جنم دیتی ہیں۔

قوموں کی زندگی میں دو قسم کے اسباب کی بنا پر تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ ایک وقتی اسباب جنہیں صحیح معنوں میں سطحی اسباب کہنا چاہیے۔ یہ اسباب قومی زندگی کی جوئے رواں کو زیر و زبر نہیں کرتے بلکہ اُس کی سطح پر معمولی سی جنبش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ہلچل سے زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا اور جلد ہی حالات معمول پر آجاتے ہیں۔ دوسرے اسباب بڑے ٹھوس، گہرے اور انقلاب انگیز ہوتے ہیں اور وہ قومی زندگی کے پُورے دھارے کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ سطح بین لوگ شرق اوسط کے اس حادثہ کو محض چند قوموں کی سازش کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اُن کے خلاف بس دل کی بھڑاس نکال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سطح سے نیچے اتر کر اُس آتش فشاں کا جائزہ لیتے ہیں جس کی گہرائیوں سے یہ لاوا پھوٹا ہے وہ کبھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ محض ایک وقتی ہنگامے کی حیثیت رکھتا ہے اور بعض اتفاقی اسباب ہی نے اسے جنم دیا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال یا دوسرے لفظوں میں اُن کی حیات و ممات کے لیے فلسفۂ تاریخ کے ماہرین نے جو اصول بیان کیے ہیں اُن میں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ کسی نصب العین سے حقیقی اور سچی محبت اور اس کے حصول کے لیے دل میں گہری لگن قوموں کو کامیابی اور کامرانی کی راہ پر لگاتی ہے۔ جس طرح ایک فرد رُوح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح ایک قوم مقصد کے عشق کے بغیر دنیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کبھی پنپ نہیں سکتی ۔ درحقیقت مقصد ہی کسی قوم کی حیات ہے اور بے مقصدی موت ۔ مقصد کی محبت کسی قوم کے منتشر اجزا کو ایک دوسرے سے جوڑ کر اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے ۔ اُسے اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا ولولہ عطا کرتی ہے ۔ نصب العین کا عشق اُسے ہر قسم کے مفادات سے بے نیاز کر کے اس کے افراد میں ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا کرتا ہے ۔ جس فرد یا قوم کو جتنا کوئی نصب العین زیادہ عزیز ہوگا اُسی نسبت سے اُس کے دل میں دوسرے مفادات بے وزن ہوں گے ۔ محبت اور ایثار دونوں لازم ملزوم ہیں ۔ مقصدِ حیات سے گہری وابستگی کے بغیر کسی قوم کے اندر نہ تو اتفاق و اتحاد پیدا ہو سکتا ہے ، نہ اُس کے اندر جذبۂ ایثار اُبھرتا ہے اور نہ زندگی کی حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے ۔

جس چیز کو فلسفۂ تاریخ مقصد سے عشق کا نام دیتا ہے اُسے مذہب ایمان سے تعبیر کرتا ہے ۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ کسی حقیقت کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا ۔ اس کے متعلق فلسفہ اور نفسیات کے ماہرین نے کہا ہے کہ یہ ایک مثبت احساس ہے جس کے زیرِ اثر نہ صرف انسان خود حقیقت کا اعتراف کرتا ہے بلکہ اُسے دنیا کی سب سے بڑی سچائی سمجھ کر اُسے پوری قوت کے ساتھ پھیلانے کی بھی کوشش کرتا ہے ۔ قطع نظر اس سے کہ کسی فرد یا قوم نے جس چیز کو حقیقت سمجھا ہے وہ فی الواقع حقیقت ہے یا نہیں ، ایمان و اعتقاد اور یقین و اذعان بجائے خود ایک بہت بڑی قوت ہے جسے کوئی فرد یا قوم حاصل کر لے تو کامیابیاں اور کامرانیاں اُس کے قدم چومتی ہیں ۔

جب ہم قومی زندگی کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں عرب ممالک کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ سوال بار بار اُبھر کر آتا ہے کہ کیا اس قوم کا کوئی ایسا کعبۂ مقصود بھی تھا جس سے اسے محبت ہو؟ اسلام جو ان ممالک کے رہنے والوں کی قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ تھا ، اُس کی محبت سے اُن کے دل خالی ہو رہے تھے اور اُس کی جگہ مغربی الحاد ، اخلاقی اباحیت ، مغربی تہذیب اور اشتراکیت کو فروغ نصیب ہو رہا تھا ۔ اس تلخ حقیقت کو بیان کرتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی اس بھیڑ میں کوئی امتیازی وصف ایسا نہ تھا جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ ایک مخصوص اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعین مقصد کے حصول کے لیے دنیا میں زندہ ہے۔ اس کے افکار و نظریات مغرب کے ملحدانہ خیالات کا پرتو تھے۔ اس کی معیشت و معاشرت مغرب کی بھونڈی نقالی تھی۔ اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے، اس کی اخلاقی اور روحانی قدریں مغرب سے مانگ مانگ کر لائی جا رہی تھیں۔ اس قوم کا حال اُس بدنصیب قافلے کا سا ہو رہا تھا جس کے افراد منزل کھو جانے کی وجہ سے منتشر ہو چکے ہوں اور بھیڑیئے ان میں سے ایک ایک پر حملہ آور ہو کر انہیں نگل جانے کی فکر میں ہوں۔ کبھی سرمایہ داری کے بھیڑیئے آتے اور ان پر جھپٹ کر ان میں سے اچھی خاصی تعداد کو اٹھا کر لے جاتے اور کبھی اشتراکیت کے جنگل سے خونخوار درندوں کے غول کے غول آتے اور ان پر اپنا تسلط قائم کر لیتے۔ یہ قوم جسے کبھی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پر ناز تھا، جسے اپنے بنیانِ مرصوص ہونے پر فخر ہوا کرتا تھا جس کے افراد کے مابین باہمی محبت اور مودت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کی تھی، شدید انتشار کی شکار ہو گئی۔ نصب العین کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی یہ قوم اپنا راستہ بھول گئی، اس کے حوصلے پست ہو گئے، اس کے عزائم میں اضمحلال پیدا ہوا اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ وہ بھلائیاں جن کے فروغ کے لیے باری تعالیٰ نے اس امت کو مبعوث فرمایا تھا وہ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں اور اُن کی جگہ وہ برائیاں ابھرنے لگیں جنہیں مٹانے کی ذمہ داری براہِ راست اس پر ڈالی گئی تھی۔ اب اس کی ساری توجہ صرف ایک بات پر مرکوز ہو گئی کہ کسی طرح اُس کے افراد زندہ رہ سکیں۔

جب کسی قوم کی روح فنا ہو جائے تو اُس کے افراد لاشے بن جاتے ہیں جن کے خون اور گوشت سے وہ ساری قومیں لذت اندوز ہوتی ہیں جنہیں انسانی لہو کی چاٹ لگی ہوئی ہو۔ ان قوموں نے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لیے ہر وہ ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کیا جو استعمار عام طور پر کرتا ہے۔ انہیں معاشی اعتبار سے برباد کیا، ان کی معاشرت تباہ کی، انہیں مختلف نوعیتوں کی سیاسی جکڑ بندیوں میں جکڑا۔ یہ بربادیاں بھی اپنی جگہ کچھ کم نہ تھیں مگر مغربی اقوام کو صدیوں کے تجربات کے بعد اس بات کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اس قوم کو روٹی سے محروم کر لینا یا اس سے تیر و تفنگ کا چھین لینا اسے نیست و نابود نہیں کر سکتا۔ یہ نقصانات اس کے لیے وقتی محرومیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے اگر اس دنیا سے بحیثیت ایک ملت مٹانا ہے تو اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف ایک ہی صورت ہے کہ اسے قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے سے یکسر نا آشنا کر دیا جائے جسے یہ ایمان کے نام سے موسوم کرتی ہے اور اس کی جگہ اس کے دل میں ان عصبیتوں کو اُبھارا جائے جو اسے جاہلیت کے طور طریقوں کی پابند بنا دیں۔

مغرب کے یہ ناپاک عزائم پُورے ہوئے اور عرب ممالک دینِ حق سے مُنہ موڑ کر ضلالت و گمراہی کی اُن راہوں پر چل نکلے جن پر یورپ شیطان کی پیروی میں برسوں سے چل رہا تھا اور جس کے خوفناک نتائج وہ کافی حد تک دیکھ چکا ہے۔ اہلِ یورپ نے صنعتی انقلاب کے وقت قوم کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کی، اور دوسری قوموں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کیا مگر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم نے اُس پر یہ حقیقت پُوری طرح ثابت کر دی کہ اس دَور میں خواہ دوسروں کے خلاف تعصب پھیلانے کے لیے کتنا ہی زور صرف کیا جائے مگر کسی قوم کے لیے جغرافیائی حدود کے اندر مقید رہنا ممکن نہیں۔ حمل و نقل کے جدید ذرائع کی وجہ سے دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ چنانچہ اہلِ یورپ نے اپنی تنظیم نو ملکی حدود کی اساس پر کرنے کے بجائے نظریاتی بنیادوں پر شروع کر دی۔ امریکہ اور برطانیہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے ہم رکاب ہیں۔ اور نیو مفادات کا اشتراک اتنی بڑی قوت بن گیا ہے کہ اس نے بظاہر متصادم تصورات رکھنے والی قوموں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا ہے۔ روس اور امریکہ کے درمیان آج جو یگانگت ہے وہ امریکہ اور فرانس کے مابین نظریاتی ہم آہنگی کے باوجود نظر نہیں آتی۔

مغرب نے اپنے ہاں تو اشتراکِ عمل کے لیے وسیع تر بنیادوں کو تلاش کیا مگر مسلمانوں کے کانوں میں شیطان کی یہ آواز پھونک دی کہ عرب عربوں کے لیے ہے، ترکی ترکوں کے لیے، ایران ایرانیوں اور افغانستان افغانیوں کے لیے۔ پھر یہ محدود قومیتیں مزید چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئیں۔ آج عرب قومیت کا صور خواہ کتنے ہی زور سے پھونکا جا رہا ہو مگر سعودی، مصری، یمنی، شامی، اُردنی، عراقی، تونسی، الجزائری، مراکشی، وغیرہ بہت سی قومیتوں نے اس نام نہاد وحدت کو نہ صرف پارہ پارہ کر دیا ہے بلکہ ان کے درمیان مفادات کی کشمکش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتنی شدید ہے کہ اسرائیل کا خطرۂ عظیم بھی ان کو جمع کرنے سے قاصر ہے۔ بارہا ان کے درمیان خونریزیاں ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو باہر کا کوئی دشمن کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بدنام اور ذلیل وخوار کرنے کے لیے پریس اور ریڈیو سے وہ گالیاں دی ہیں جو شاید کوئی بیرونی دشمن بھی نہ دیتا۔ حتیٰ کہ دنیا نے یہ شرمناک منظر بھی دیکھا کہ مراکش اور الجزائر کی جنگ میں دشمنِ اسلام ہیلا سیلاسی مصالحت کرانے کے لیے آیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کے لیے انہیں دین کی رسی تھامنے کی ہدایت کی تھی مگر انہوں نے باری تعالیٰ کی اس رحمت کو ٹھکرا کر رنگ، نسل، وطن کا طوق گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے ممیز اور ممتاز کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لفظوں میں مغرب جس لعنت کے تباہ کن اثرات دیکھ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا مسلمانوں نے اسی لعنت کو خود آگے بڑھ کر اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ اس قوم سے زیادہ بدنصیب قوم دنیا میں کونسی ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالیٰ خاک وخون جیسے مادی رشتوں سے بے نیاز کر کے اس کی تعمیر کے لیے خالص روحانی اقدار عطا فرمائے لیکن وہ اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کو لات مار کر رنگ، نسل، وطن جیسے اتفاقی حادثات کو اپنی قومیت کی اساس بنانے پر مصر ہو۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ نقالی خواہ افکار ونظریات کی ہو یا افعال واعمال کی اس میں کبھی تخلیقی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقالی کسی داخلی انقلاب کا عملی اظہار نہیں ہوتی بلکہ دوسرے افراد یا دوسری اقوام سے ذہنی اعتبار سے مرعوب ہو کر ان کے سطحی اور خارجی حالات کو اپنانے کی ناکام اور بھونڈی کوشش ہوتی ہے۔ کیا دنیا میں کبھی کوئی ایسا درخت بھی برگ وبار لا سکتا ہے جس کی اپنی کوئی جڑیں ہی نہ ہوں؟ اس ضمن میں ابن خلدون نے اس نقالی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ جو افراد یا قومیں دوسروں کی نقالی کرتے ہیں وہ ہمیشہ ان کی برائیاں اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں مگر ان کی خوبیاں اپنانے کی ان میں کبھی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے مفلوج اور عملی لحاظ سے پست ہوں اور اس بات کے آرزومند ہوں کہ وہ اپنی ظاہری ہیئت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بعض ایسی تبدیلیاں پیدا کرلیں کہ اُن میں اور جن لوگوں سے وہ مرعوب ہیں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

کسی قوم کے سارے خارجی حالات ایک ہی نوعیت کے نہیں ہوتے۔ اُس کے بعض اعمال بڑے ٹھوس اور وزن دار ہوتے ہیں اور وہ کسی مضبوط اور حیات آفریں تصور کی عملی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی وہ مثبت اعمال ہیں جن کی وجہ سے کوئی قوم دنیا میں سر بلند ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے بعض دوسرے اعمال میں بڑی سطحیت اور اوچھا پن پایا جاتا ہے جو اس کی ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا موجب ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم کے سارے افراد زندگی کے ہر شعبے یا حیاتِ مستعار کے ہر لمحے اُس ضبط اور ایثار سے کام نہیں لے سکتے جو مثبت اعمال کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس قوم میں مختلف نوعیتوں کی کمزوریاں راہ پانا شروع کرتی ہیں۔ نقالی کرنے والے افراد یا قومیں چونکہ پست ہمت، تخلیقی صلاحیتوں سے عاری اور ایثار اور قربانی سے نا آشنا ہوتی ہیں، اس لیے وہ ان برائیوں کو تو اپنا لیتی ہیں جن میں کوئی مشقت اٹھانی نہیں پڑتی، اور اُن اعمال سے دستکش رہتی ہیں جو محنت، عزم اور ضبطِ نفس کے طالب ہوں۔

یہ اصول یوں تو آج دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں کار فرما نظر آتا ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے یورپ کی نقالی میں قومیت کے علمبردار بننے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں ہمیں سوائے رسوائی ذلت وخواری اور باہمی سر پھٹول کے اور کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ قوم پرستی کی تحریک بلاشبہ اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتی ہے اور یہ خامیاں اب اتنی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہیں کہ اس کے بارے میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مگر خامیوں کے ساتھ اس میں کئی ایک خوبیاں بھی ہیں جن سے یورپ نے خوب فائدہ اٹھایا مگر ہم اس کی نقالی میں سوائے خامیوں اور برائیوں کے کوئی دوسری چیز اپنا نہ سکے۔ اس تحریک سے پہلے اہلِ یورپ پوپ کی غلامی میں بُری طرح گرفتار تھے۔ اس عہدے پر جو شخص بھی فائز ہوتا وہ جس طرح چاہتا عوام کے مذہبی احساسات سے کھیلتا۔ چونکہ مسیحیت انسان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں کوئی واضح تعلیمات نہیں دیتی اس لیے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاملات میں پوپ کے ذاتی خیالات ہی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے اور عوام انہیں فرامینِ الٰہی سمجھ کر بلا چون وچرا مانتے چلے جاتے تھے۔ پوپ کی اس حیثیت نے لوگوں کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا اور یہ صاحب اپنی اس اونچی حیثیت سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اہلِ یورپ نے ان افسوسناک حالات کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ جب مسیحیت ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کے لیے کوئی ضابطہ نہیں دیتی تو ہم ایک شخص یا ایک گروہ کے ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھنے کے بجائے کیوں نہ خود اپنے قومی مفادات کو دیکھ کر اپنی زندگی کے معاملات کو طے کریں، اور اگر ہمیں قربانی دینی ہی ہے تو پوپ کی خاطر دینے کے بجائے اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کیوں نہ دیں۔ اس لیے انہوں نے پوپ کی پرستش کے بجائے قوم کی پرستش شروع کر دی اور اجتماعی معاملات کو قومی سُود و زیاں کے مطابق طے کرنا شروع کر دیا۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی سے اُن کی فکری غلامی کی زنجیریں کٹیں، انہوں نے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا شروع کیا، انہیں اپنی قوم اور اپنے قومی مفادات سے محبت ہونے لگی اور ان کے اندر اس کے لیے ایثار اور قربانی کا جذبہ بیدار ہوا۔ ان مثبت احساسات کی وجہ سے قوم کے مختلف طبقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوا، قوم کے ہر فرد نے اپنی قوم کی سربلندی اور اپنے وطن کی بہتری کے لیے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں اور پوری ایک صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ پوری دنیا کی زمامِ کار یورپ کے ہاتھ میں آگئی۔

ہم نے یورپ کی اس ترقی کو دیکھتے ہوئے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ جب تک ہم اپنے آپ پر قوم پرستی کا جنون سوار نہیں کرتے اس وقت تک ہماری فلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہم نے اسلام کی آفاقی اور روحانی اساس کو چھوڑ کر وطن اور رنگ کی مادی اساس پر اپنی قومیت کی تعمیر کرنی چاہی۔ مگر ہم کوشش کے باوجود اسے متعدد وجوہ کی بنا پر اپنانے میں سخت ناکام رہے۔

ان میں پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام جہاں ہمیں انفرادی نیکی اور پرہیزگاری کے لیے ایک ضابطہ دیتا ہے وہاں ہمیں اجتماعی زندگی کے لیے بھی نہایت واضح اصول عطا کرتا ہے اور صدیوں تک ان اصولوں کے مطابق ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گاڑی چلتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرستی کا مسلک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار کرنے کے ساتھ ہی ہمیں خدا پرستی کے بہت سے تقاضوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ اس طرح نہ صرف ہر مسلمان کے دل و دماغ میں بلکہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے درمیان شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ یورپ میں اجتماعی تعلیمات کا منبع پوپ تھا اس لیے انہیں پسِ پشت ڈال کر لوگوں نے چین کا سانس لیا، مگر مسلمانوں میں چونکہ ان کا مبدأ و ماخذ اللہ اور اس کا رسول ہے اس لیے انہیں ذہنی اور قلبی دونوں لحاظ سے سخت اضطراب سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی عقل یہ باور نہ کر سکتی تھی کہ اللہ اور اُس کے رسول کی دی ہوئی ہدایت اُن کے لیے فوز و فلاح کا موجب بننے کے بجائے کسی اعتبار سے اُن کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر ان کے سامنے یہ تاریخ بھی موجود تھی کہ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے سے انہیں دنیا میں اطمینان و سکون، عزت و وقار اور عظمت و سربلندی کی کیسی عظیم دولت نصیب ہوئی تھی اور اس سے انسانیت کو کیسے لاتعداد فائدے پہنچے تھے۔ ان حالات میں قوم پرستی کے مطالبات کے پیشِ نظر دین کے تقاضوں سے منہ موڑ لینا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس مسلک کو ایک نہایت مختصر سے طبقے کے سوا کسی نے قبول نہ کیا اور اس طرح قوم متحد ہونے اور سرگرم عمل ہونے کے بجائے الٹی انتشار اور مایوسی کی شکار ہوئی اور اُس کی قوتیں تعمیر و ترقی کے بجائے باہمی سر پھٹول میں ضائع ہونے لگیں۔ ہم نے اس قوم پرستی سے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خود اپنے بھائی بندوں کے خلاف شدید نفرت کے رجحانات پیدا کیے، ان کے اندر قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور قوم کے مختلف طبقات کے درمیان محبت اور یگانگت کی جگہ نفاق کے بیج بوئے۔ الغرض قوم پرستی کی اس تحریک سے ہم کوئی خیر تو حاصل نہ کر سکے البتہ اس کا سارا شر ہمارے حصے میں آ گیا۔ اس تحریک سے مغربی قوموں میں تو جمہوریت نے نشو و نما پائی، کیونکہ اس کے پیچھے جو مختلف محرکات کام کر رہے تھے ان میں ایک یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ قوم کی فلاح و بقا کسی مخصوص فرد یا کسی مخصوص خاندان یا مخصوص طبقے سے وابستہ نہیں بلکہ قوم کا ہر فرد اس میں شریک ہے اس لیے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے بھلے اور بُرے کے بارے میں سوچے اور اس ضمن میں اس کی جو رائے ہو اُسے بے کم و کاست بیان کر دے۔ اس رائے کو خواہ قبول کیا جائے یا رد کر دیا جائے، مگر اس کے اظہار کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ مگر ہمارے اندر یہی تحریک آمریت اور استبداد لے کر آئی۔ ہم اس کی خوبیوں میں سے کوئی خوبی بھی اپنا نہ سکے۔ صرف نفرت و حقارت، جبر و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استبداد، ایک دوسرے کے خلاف سخت بے اعتمادی، اپنوں ہی کو ملک وملت کا دشمن ٹھہرانے اور ان کا گلا گھونٹنے، اور غیروں سے سیکھے ہوئے نظریات کو زبردستی اپنی قوم پر ٹھونسنے کا سبق ہم نے اس سے حاصل کیا۔ ہمارے ہاں ملت کے ہر فرد کو ملکی معاملات میں دخیل کرنے اور اس پر ان کی ذمہ داری ڈالنے کے بجائے اُسے زیادہ سے زیادہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ کیا گیا کہ تجھے ملت کی فکر کرنے کے بجائے خود اپنے بھلے بُرے کے بارے میں بھی نہ سوچنا چاہیے بلکہ یہ حق صرف حکمراں طبقے کو سونپ کر خود اُس کی اطاعت و فرمانبرداری میں منہمک ہو جانا چاہیے۔

آج دنیا کا کونسا ایسا مسلمان ملک ہے جس میں حکومت کے کاروبار عوام کے منشا اور مرضی کے مطابق چل رہے ہیں؟ مصر، شام، ایران، عراق، الجزائر، سعودی عرب، الغرض مسلم آبادی کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس کے متعلق وثوق سے کہا جائے کہ وہاں کے حکمرانوں کے عزل ونصب میں آخری اختیار وہاں کے عوام کو حاصل ہے اور پھر یہ حکمران اُن کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق امور مملکت چلانے کے پابند ہیں۔ وحی و الہام اور باری تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کرنے کا سلسلہ ختم الرسل، سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اس بنا پر کوئی شخص یا طبقہ اب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے افکار ہر خطا سے منزہ اور اس کی آراء ہر کمزوری سے پاک ہیں۔ ہم زبان کی حد تک اسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے معاملات باہمی صلاح مشورے سے طے کرنے چاہئیں۔ مگر ہمارے ہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ "ملت کے چند غم خوار" طاقت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں اور پھر طاقت ہی کے بل بوتے پر عوامی خواہشات کے علی الرغم اپنی مرضی کا سکہ چلاتے ہیں۔ اہل یورپ نے قومیت کی تحریک اپنا کر پوپ کی خدائی اور شہنشاہوں کی کبریائی کو ختم کیا۔ اپنے عام افراد کو پستی اور غلامی سے اٹھا کر انہیں ایک با اختیار ہستی بنایا۔ مگر ہمارے ہاں اس تحریک کے بطن سے آمریت نے جنم لیا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم میں فکری آزادی کے اُن تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ نہیں جو یہ تحریک اپنے ساتھ لاتی تھی۔ جب ہر فرد کو امورِ مملکت کے چلانے میں شریک کیا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو پھر اُس کے خیالات کو بھی سننا پڑتا ہے، اس کے احتساب کو بھی برداشت کرنا ہوتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کے بارے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنا پڑتا ہے۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے جسے پست ہمت نقال کبھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ قوم پرستی انہیں قبول ہے، مگر افرادِ قوم کی آزادی انہیں قبول نہیں۔

تاریخ کی دوسری بڑی صداقت جسے مسلمان مغرب کی بے مغز نقالی میں نظر انداز کر گئے ہیں وہ یہ ہے کہ وطن، رنگ، نسل زبان پر قومیت کی بنیاد خواہ وقتی طور پر کتنی مضبوط نظر آئے مگر جلد ہی یہ متزلزل ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جس قوم کی تشکیل کسی حیات آفریں تصور پر کی جائے وہ زیادہ دیرپا اور مضبوط ہوتی ہے۔ وطن، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود سب محدود چیزیں ہیں۔ ان کے اندر وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ اگر عربوں کو ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو قدرتی طور پر غیر عربوں کے لیے اس کا دروازہ بند ہو گا۔ آپ اگر سفید نسل والوں کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے خواہشمند ہوں گے تو سیاہ زرد اور گندمی نسل والوں کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ قومیت کو اس طرح چند مادی حدود سے محدود کرنے کا وہی نقصان ہوتا ہے جو پانی کو ایک مقام پر مقید کرنے کا ہوتا ہے۔ کچھ مدت تک تو اس پانی کی افادیت ہوتی ہے مگر چونکہ اس میں باہر سے مزید پانی شامل نہیں ہو سکتا اس لیے یہ جلد ہی متعفن ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حال قوموں کا ہے۔ جو قومیں نظریات کی اساس پر منظم ہوتی ہیں ان کی حیثیت ایک بہتے ہوئے دھارے کی ہوتی ہے جس میں ہر لمحہ اور ہر مقام پر مختلف اطراف سے تازہ پانی بلا روک ٹوک ملتا رہتا ہے اور اس طرح اُس دھارے کی قوت و طاقت اور اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر جو قومیں اپنے آپ کو مادی حدبندیوں میں مقید کرنے کی کوشش کرتی ہیں وہ چند سالوں کے بعد ہی اپنی قوت کھو بیٹھتی ہیں۔ اہلِ مغرب اس حقیقت کو بھانپ کر اپنے فکر و نظر کے زاویوں میں بنیادی تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب وہ جس چیز کا پرچار کرتے ہیں وہ رنگ و نسل اور وطن کی بجائے نظریات و اقدار ہیں۔ مثلاً اب کوئی یہ نہیں کہتا کہ امریکہ اور برطانیہ اور روس کی برتری قائم ہونی چاہیے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت اور آزادی یا معاشی تحفظ، یا معاشرتی عدل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا میں کامیاب و کامران ہونا چاہیے۔

تاریخ کی ایک اور بڑی حقیقت جس کا اس دَور کے مسلمان اچھی طرح ادراک نہیں کرسکے وہ یہ ہے کہ مادی اسباب ہمیشہ ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کبھی کسی قوم کو زندگی کی حرارت اور ولولہ عطا نہیں کر سکتے۔ جو قومیں صرف انہیں اپنی حیات کا مقصود و مطلوب ٹھہرا کر ان کے حصول میں سرگرداں ہوتی ہیں انہیں یہ کبھی حاصل نہیں ہوتے۔ اور اگر ان کی معمولی سی مقدار حاصل بھی ہو جائے تو وہ مفید اور کارآمد ہونے کے بجائے سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کی بے مغز قوموں کے ہاتھ میں مادی وسائل اسی طرح خطرناک ہوتے ہیں جس طرح کسی اناڑی یا کسی بچے کے ہاتھ میں بے نیام تلوار۔ وہ انہیں صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکتیں، بلکہ بسا اوقات ان کے فراہم کیے ہوئے ہتھیار ان کا دشمن استعمال کرتا ہے۔ یہ وسائل اسی صورت میں مفید ہوتے ہیں جب یہ کسی بلند نصب العین کے حصول کی جد و جہد کے نتیجے میں ہاتھ آئیں اور ان سے قوم اسی وقت ٹھیک کام لیتی ہے جبکہ اس کے ایک ایک سپاہی اور فوجی افسر کے دل میں نصب العین کے عشق کی آگ بھڑک رہی ہو۔ اصل میں کسی قوم کی سربلندی کا فطری راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم سب سے پہلے کسی حیات آفریں نصب العین کو پورے خلوص کے ساتھ اپنا کر اس کے حصول کے لیے عملی جد و جہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اس جد و جہد میں زیادہ سے زیادہ قوت و طاقت فراہم کرے گی تاکہ وہ اپنے مقدس نظریہ حیات کی کامیابی کے ساتھ محافظت و پاسبانی کرے اور اس کی مخالف قوتوں کا زور توڑے اور بالآخر انہیں اس کے سامنے سرنگوں کرنے میں کامیاب ہو۔ جس چیز کی حیثیت محض ذریعہ کی ہو اُسے اگر غایت بنا لیا جائے تو اس سے معاملہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں۔

مسلمان آج جس فکری اور عملی پریشانی کا شکار ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ مادی اسباب کی فراہمی کو زندگی کا مقصود ٹھیرا کر اس میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے یہ ایک ایسی فکری لغزش ہے جس کا ہم گزشتہ ایک سو سال سے ارتکاب کر رہے ہیں اور کسی صحیح نتیجہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں پہنچتے۔ اس طرز فکر میں جو خامی ہے وہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر محض دنیاوی مال و متاع کی فراوانی کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہوتی تو پھر اُسے کبھی زوال نہ آتا اور انسان باری تعالیٰ کی اس حکمت "وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کے کرشموں کا کبھی مشاہدہ نہ کرسکتا۔ ایک قوم جسے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مادی طاقت ہاتھ آجاتی وہ قیامت تک سربلند ہی رہتی اور اُسے کبھی زوال نہ آتا۔ مگر پوری انسانی تاریخ اس کے خلاف شہادت فراہم کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بالکل غیر معروف اور کمزور قوم میں اچانک زندگی کی حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی صفوں میں جہاں انتشار کے علاوہ اور کوئی بات دکھائی نہ دیتی تھی، اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ وہ قوت و طاقت کو غلام بناتی ہے اور دنیا پر چھا جاتی ہے پھر جب وہ دنیا پر چھائی ہوئی ہوتی ہے، اُس کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں اور کوئی دوسری دبی ہوئی غیر معروف قوم اُٹھ کر اس کا تختہ اُلٹ دیتی ہے، اور تاریخ کے وہی اوراق جو اُس کے کارناموں سے جگمگاتے تھے وہی اس کے مدفن بھی بنتے ہیں۔ عاد و ثمود کی قومیں، روم و یونان کی قومیں، مصر اور ایران کی قومیں مسلمان اور عیسائی قومیں، پھر دورِ جدید میں برطانیہ، جرمنی، جاپان، فرانس الغرض ماضی و حال کی کونسی قوم ایسی ہے جسے عروج حاصل ہونے کے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ مادی اسباب فراہم نہ ہوئے ہوں۔ مگر جب اُس پر اضمحلال طاری ہوا تو یہ اسباب اُسے زوال سے بچانے میں یکسر ناکام رہے بلکہ ان اسباب ہی نے اس کی کمر توڑ دی۔

دُور نہ جائیے، چین کے حالات پر ہی غور کیجیے۔ چینی قوم کے پاس یہی ملک تھا، اس کے پاس قدرت کے یہی عطیات تھے، مگر اس ملک اور ان عطیات کے ہوتے ہوئے بھی یہ دنیا کی سب سے زیادہ نامراد قوم تھی۔ جاپان جیسا چھوٹا ملک جس وقت چاہتا اسے دبا لیتا۔ ترقی تو درکنار اس کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر اُس نے چند سال پیشتر ایک نصب العین کو دل و جان سے اپنایا اور اُسے اپنی زندگی کا مقصود قرار دیا۔ پھر اس کے حصول کے لیے جد و جہد شروع کی اور دیکھتے دیکھتے دنیا کی طاقتور قوم بن گئی۔ جاپان تو خیر اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے دنیا کی بڑی بڑی قومیں آج اس سے خائف ہیں۔ اس قوم کی نسل نہیں بدلی، اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا اُس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس کے ملک کے جغرافیائی حالات میں کوئی تغیر رُونما نہیں ہوا اس کے قدرتی وسائل نے اب کسی غیر معمولی فیاضی کا ثبوت نہیں دیا۔ وہی قوم ہے، اس کی وہی نسل ہے، وہی اس کا ملک اور وہی اُس کے وسائل ہیں۔ مگر نصب العین کے عشق نے اسے سرتاپا بدل کر رکھ دیا ہے اور آج اگر اس کے قبرستانوں سے مُردے زندہ ہو کر اپنے بھائی بندوں کو دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ ان کی ان نئی سرگرمیوں کو دیکھ کر انہیں پہچاننے سے قاصر رہیں۔

اس قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کو دیکھیے۔ وہ تعداد میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اس سے بہت زیادہ رقبہ ان کے پاس ہے۔ اس سے بہت زیادہ وسائل ان کو میسّر ہیں۔ اُن کا ماضی کا ورثہ چینی قوم سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اُن کے دین نے جو نصب العین اور ضابطۂ حیات ان کو دیا ہے اس کا مقابلہ چینی تو کیا، دنیا کی کسی قوم کا بھی نصب العین اور ضابطۂ حیات نہیں کر سکتا۔ وہ چونکہ خالقِ کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے دیا ہے اس لیے وہ سراپا خیر ہی ہے۔ کسی خامی کا اس میں شائبہ تک نہیں ہے۔ اس میں غیر معمولی توازن اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے۔ پھر اس نصب العین اور ضابطۂ حیات میں ایک تقدس پایا جاتا ہے جو انسانوں کے روحانی احساس کی بھی تسکین کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ آج ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ مٹھی بھر قوموں کا دنیا میں وزن ہے مگر ان کا کوئی وزن نہیں۔ دنیا انہیں اپنے سینے پر بار سمجھ رہی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی مردہ رُوح کو زندہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ مُردہ جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل جمع کرنے کی فکر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ وسائل اس کے لیے کچھ مفید اور کار آمد ہونے کے بجائے اس کے لیے تکلیف اور مصیبت کا موجب بن رہے ہیں۔

اہل چین کی روح میں چونکہ قوت و طاقت ہے اس لیے اُن کا پورا نظامِ زندگی اُسی طرح ٹھیک چل رہا ہے جس طرح کہ کسی تندرست فرد کے اعضاء و جوارح ٹھیک کام کرتے ہیں۔ ایک صحت مند آدمی جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی چیز کھاتا ہے تو وہ اس کا جزو بدن بن کر اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے۔ مگر جب بیمار آدمی اُسی چیز کو استعمال کرتا ہے تو وہ اُس کے جسم میں متعدد عوارض پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ با مقصد قوم کے ہاتھ میں جب مادّی وسائل آتے ہیں تو وہ ان سے کس طرح بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنے اندر بہتر توانائی اور بہتر کارکردگی پیدا کرتی ہے اور اس سے بالآخر معاشرے کے ہر فرد کو کس طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر اس کے برعکس جب ایک بے مقصد یا دوسرے لفظوں میں رُوح سے عاری قوم مادّی وسائل کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی ہے تو اسے نہ تو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے اور نہ ان کے حاصل ہونے سے اس کی قوت بڑھتی ہے بلکہ اس کے اندر کئی قسم کی برائیاں پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ دودھ ایک تندرست و توانا انسان کے لیے کتنی صحت بخش غذا ہے مگر اگر اسے مُردہ انسان کے مُنہ میں انڈیل دیا جائے تو سوائے لاش کا وزن بڑھنے اور تعفن میں اضافہ ہونے کے اور کونسا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

آپ براہِ کرم سوچیے کہ آخر یہ مسلمان قوم کتنے عرصے سے مادّی وسائل فراہم کرنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور اس کے لیے کتنے عجیب و غریب منصوبے بنائے گئے ہیں۔ مال و متاع کی ہوس، مادی اسباب کی محبت اور معیار زندگی بڑھانے کے جنون نے ہم سے کیا کچھ نہیں کروایا۔ اس کے لیے ہم نے اپنی دینی تعلیمات کو پس پشت ڈالا۔ غیروں کے سامنے دست سوال دراز کیا، اپنی ملّی غیرت کو بیچا۔ اپنوں سے بگاڑ کیا اور اُن لوگوں کو گلے سے لگایا جنہوں نے ہماری قومی زندگی کے خلاف ہر مرحلے پر خوفناک سازشیں کی ہیں۔ مگر خدا کی ناراضگی اور اس ساری ذلّت و خواری کے باوجود ہم دنیاوی اعتبار سے بھی وہ وسائل حاصل نہ کر سکے جو ایک نصب العین کے عشق میں سرشار قوم نے ۵ اسال میں حاصل کر کے دکھا دیئے ہیں۔ ہم نے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے آپ کو اربوں روپے کے قرضے میں جکڑ لیا مگر افسوس کہ ہمارا یہ خواب خواب ہی رہا، شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

پھر ان مادی اسباب کی فراوانی نے ہمیں قوت عطا کرنے کے بجائے قومی نقطۂ نظر سے مضمحل کیا۔ پُوری قوم دولت کی محبت میں ایسی اندھی ہوئی کہ اُس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی نہ رہا۔ ہر فرد نے اپنی زندگی کا یہی مقصد سمجھا کہ کم سے کم وقت میں کم سے کم محنت صرف کر کے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے خواہ یہ کسی طریق سے حاصل ہو۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز تو پہلے ہی اٹھ چکی تھی اب قانونی اور غیر قانونی کی تمیز بھی باقی نہ رہی۔ مذہب کا احترام تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا، اب قانون کا احترام بھی جاتا رہا اور اسی طرح پوری قوم میں لاقانونیت پھیلنی شروع ہو گئی۔ ہر شخص نے کوئی قدم اٹھاتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اس سے ملت کو فائدہ پہنچے گا یا نقصان، بلکہ اس نے صرف یہ دیکھا کہ اس کام کے کرنے سے اس کے اپنے ہاتھ کہاں تک رنگے جا سکیں گے۔ اس سے عوام کے اندر جو اخلاقی انحطاط پیدا ہوا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی طویل جائزے کی ضرورت نہیں۔ آج مسلم ممالک میں رشوت ستانی، چور بازاری، اقربا نوازی، اسمگلنگ، قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور دھوکہ بازی کا جو بازار گرم ہے اس کے تصور سے انسانی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔

ان مادی وسائل کے فراہم کرنے میں جو تھوڑی سی کامیابی ہمیں نصیب ہوتی ہے وہ بھی ہمارے لیے وبالِ جان بن گئی ہے۔ یہ وسائل چونکہ کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کے لیے فراہم نہیں کیے گئے بلکہ انہیں خود مقصد سمجھ کر اکٹھا کیا گیا ہے اس لیے ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی جامع منصوبہ موجود نہیں۔ ہر فرد یا طبقہ انہیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہا ہے اور اس بات کے لیے ہر لمحہ کوشاں ہے کہ ان کا کوئی حصہ دوسرے کی طرف منتقل نہ ہونے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی دولت پورے ۔ شرے میں گردش کرنے اور ہر طبقے کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی میراث بن گئی ہے۔ جن محنت کشوں کے خون پسینے سے قومی دولت پیدا ہوتی ہے ان کی اکثریت اس سے محروم رہتی ہے اور اس کا اکثر و بیشتر حصہ ایک مختصر سا طبقہ ہتھیا لیتا ہے۔ اس دولت کے پیدا کرنے والے بنیادی ضروریات تک سے محروم رہتے ہیں، صرف چند خاندان اس پیدا عیش دیتے ہیں۔ یہ لوگ اسے تعمیری کاموں میں صرف کرنے کے بجائے اسے اپنی عیاشیوں میں اڑاتے ہیں۔ آپ اگر دنیا کے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

© rasailojaraid.com